

نایافت

احمد فراز



نایافت

احمد شراز

NAYAFT

(Urdu Poetry)

by

AHMAD FARAZ

Year of Edition 2002

ISBN-81-87666-21-8

نام کتاب
مصنف احمد فراز
سن اشاعت ۲۰۰۲ء
قیمت ۸۰ روپے
مطبع کاک پرنٹرس، دہلی

Published by:

Kitabi Duniya

1955, Turkman Gate, Delhi-6 (INDIA)

E-mail kitabiduniya@rediffmail.com

انتخاب

میں تیرا نام نہ لوں پھر مٹی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

وہ قحطِ حرفِ حق ہے کہ اس عہد میں فراز
خود سا گناہگار پیہم لگے مجھے

ترتیب

- 9 وہاچہ
- 11 ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تو
- 13 عجیب رت تھی کہ ہر چند پاس تھا وہ بھی
- 14 فقیہ ت
- 16 سچ کا زہر
- 18 ہر آستان میں کہاں فوٹے مہمانہ وہ
- 20 تیرے قریب آ کے بڑی الجھنوں میں ہوں
- 22 تخلیق
- 24 یہ کیسی رت ہے
- 26 آنکھ سے دور نہ ہو دل سے اتر جائے گا
- 27 اب شوق سے کہ جاں سے گزر جانا پابھی
- 29 مگنی رت
- 31 کردار
- 34 نظر بھی تو کرشے بھی روز و شب کے گئے

- 30 روزِ نامہِ منِ رشاد
- 41 بدن میں آگ ہے چہرہ بھگت میرا ہے
- 43 فنا نورِ دہا دل
- 45 کہا تھا کس نے تجھے آہِ دو گناہ نے ہے
- 46 نہ اب ہوا نہ موقع ہے ہاتھ ملنے کا
- 47 فصلِ رحیمیں
- 49 سلامتی کو نسل
- 52 گزرا: دوں میں شرف سے بھی بہتر لگے مجھے
- 54 مرے قلم پہ رہی نوک میں کے فخر کی
- 56 قاتل
- 58 نہیں ہے یوں
- 60 مزاجِ ہم سے زیادہ بداند تھا اُس کا
- 62 پلو اسی سے کہیں دل کا مال جو بھی ہو
- 63 کشن بنی بنی
- 75 تڑپ اُٹھوں بھی تو یوں تری دہائی نہ دوس
- 77 خوابِ مہوئے خواب
- 79 آئینہ

- 80 درد کی راہیں نہیں آسمان ذرا آہستہ چل
- 82 گلہ نہ کر دل ویراں کی ناسیاسی کا
- 83 نذر نذر دل
- 85 سحر تو بوند کو بھی ترسا دکھائی دے
- 87 یہ دل کا چور کہ اسکی ضرورتیں تھیں بہت
- 88 چلو اُس بُت کو بھی رو لیں
- 93 سائے کی طرح نہ خود سے رم کر
- 95 دوست درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا
- 96 ٹوہنیا
- 98 نوحہ
- 99 یاد آتا ہے تو کیوں اُس سے گلہ ہوتا ہے
- 100 چاند اور میں
- 103 وار فنگی میں دل کا چلن اجہا کا تھا
- 104 سہرا
- 106 لگا کے زخم بدن پر تبا نہیں دیتا ہے
- 107 بچے تھے یار بڑے زخم میں ہوا کی طرح
- 109 اگر یہ سب کچھ نہیں -----

112

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی مانتیں کرنی

114

فتیہ شہر کی مجلس سے کچھ بے ہوا

116

دینام

دیا چہ

یہ قصہ پُرانا ہے
 جب بعض ہونٹوں نے چاہا
 کہ لفظوں کو آواز کی زندگی دیں
 تو خود ان کو زہر اب پیٹا پڑا تھا
 کہ اہل حکم کو یہ ڈرتھا
 یہ الفاظ
 آواز کی زندگی سے
 کوئی داستان بن نہ جاتیں

..... اور وہ ہونٹ چپ ہو گئے تھے

سکنتے زہیتے ہوئے لفظ

قاتل کی شمشیر سے نیم جاں

مدتوں تک فراقِ صدا میں

دھڑکتے رہے ہیں

کسے کیا خبر تھی

کہ ن بسملوں کا لہو..... قطرہ قطرہ

لکیروں کی صورت دمکتا رہے گا

اور اب یہ

لہو کی لکیریں

بجائے خود اک داستاں بن گئی ہیں



جُوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تُو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تُو

مری مثال کہ اک نخل خشک صحرا ہوں
ترا خیال کہ شاخ چمن کا طائر تُو

میں جانتا ہوں کہ دنیا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بطن ہر تُو

ہنسی خوشی سے بچھڑ جا کر گھپڑنا ہے
یہ ہر مقام پہ کیا سوچتا ہے احسن تُو

فضا اُداس ہے رُت محل ہے میں چپ بُول
جو ہو سکے تو چپ لا آ کسی کی حنا طر تو

فراز تو نے اُسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زرا اور صرف شاعر تو



عجیب رُت تھی کہ ہر خرید پاس تھا وہ بھی
بہت ملول تھا میں بھی اُداس تھا وہ بھی

کسی کے شہریں کی گفت گو ہواؤں سے
یہ سوچ کر کہ کہیں اُس پاس تھا وہ بھی

ہم اپنے زعم میں خوش تھے کہ اُس کو بھول چکے
مگر گمان تھا یہ بھی قیاس تھا وہ بھی

کہاں کا اب غم دنیا کہاں کا اب غم جاں
وہ دن بھی تھے کہ ہمیں یہ بھی راس تھا وہ بھی

فراز تیرے گریباں پہ کل جو نہتا تھا
اُسے ملے تو دریدہ لباس تھا وہ بھی

غیبت

میں کتنی وارفتگی سے اس کو سن رہا تھا
 وہ ساری باتیں وہ سارے قصے
 جو اس سے ملنے سے پیشتر
 میری زندگی کی حکایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
 کہ اور بھی لوگ تھے
 جنہیں میری آرزو تھی مری طلب تھی

کہ جن سے میری محبتوں کا رہا تعلق
کہ جن کی مجھ پر غنائیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اُن میں کچھ کو تو میں نے
جاں سے عزیز جانا
مگر اُنہیں میں سے بعض کو
میری بے دلی سے شکایتیں تھیں

میں ایک اک بات
ایک اک جرم کی کہانی
دھڑکتے دل کا نپتے بدن سے سُنا رہا تھا
مگر وہ پتھر بنی
مجھے اس طرح سے سُنتی رہی
کہ جیسے مرے لبوں پر
نئی مقدس نزیں صحیفے کی آیتیں تھیں

سچ کا زہر

تجھے خبر بھی نہیں
 کہ تیری ادا اس ادھوری
 محبتوں کی کہانیاں
 جو بڑی کشادہ دلی سے
 بنس بنس کے سن رہا تھا
 وہ شخص تیری صداقتوں پر فریفتہ
 با وفا و ثابت قدم

کہ جس کی جبین پہ
ظالم رقابتوں کی جلن سے
کوئی شکن نہ آئی
وہ ضبط کی کرناک شدت سے

دل ہی دل میں
خموش، چپ چاپ
مر گیا ہے

C

ہر آشنائیں کہاں خورے محسوس نہ وہ
کہ بے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ

کہاں سے لائیں اب آنکھیں اُسے کہ رکھتا تھا
عداوتوں میں بھی انداز مخلصانہ وہ

جو ابر تھا تو اُسے ٹوٹ کر پرستاتا
یہ کیا کہ آگ لگا کر ہوا روانہ وہ

پکارتے ہیں مہ و سال منزلوں کی طرح
لگا ہے تو سن سستی کو تازیانہ وہ

ہمیں بھی عسّم طلبی کا نہیں رہا یا را
تڑے بھی رنگ نہیں گردشِ زمانہ وہ

اب اپنی خواہشیں کیا کیا اُسے لاتی ہیں
یہ بات ہم نے کہی تھی مگر نہ مانا وہ

یہی کہیں گے کہ بس صورتِ آشنائی تھی
جو عہد ٹوٹ گیا یاد کیسا دلانا وہ

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دکھیں
نگار تھا، نطنہ آیا بنگارِ حسانہ وہ

فرازِ خواب سی دُنیا دکھائی دیتی ہے
جو لوگ جانِ جہاں تھے ہوئے فسانہ وہ



تیرے قریب آ کے بڑی الجھنوں میں ہوں
میں دشمنوں میں ہوں کہ تے دوستوں میں ہوں

مجھ سے گریز پاس ہے تو ہر راستہ بدل
میں سنگِ راہ ہوں تو بھی راستوں میں ہوں

تو آچکا ہے سطح پہ کب سے خبر نہیں
بے درو میں ابھی انھیں گسہ اسوں میں ہوں

اسے یارِ خوش دیار تجھے کیسا خبر کہ میں
کب سے ادا یوں کے گھنے جنگلوں میں ہوں

تو ٹوٹ کر بھی اہل تمنا کو خوش نہیں
میں ٹٹ کے بھی وفا کے انہی قافلوں میں ٹٹیں

بدلانہ میرے بعد بھی موضوع گفتگو
میں جا چکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں

مجھ سے بچھڑ کے تو بھی تو روئے گا سمر ہر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں

تو ہنس رہا ہے مجھ پہ مرا حال دیکھ کر
اور پھر بھی میں شریک ترے قہقہوں میں ہوں

خود ہی مثالِ لالہ صحرالہولہو
اور خود فراز اپنے تماشا یوں میں ہوں

تحسین

درد کی آگ بجھا دو کہ ابھی وقت نہیں
 زخمِ دل جاگ سکے نشترِ غمِ رقص کرے
 جو بھی سانسوں میں گھلا ہے اُسے عریاں نہ کرو
 چپ بھی شعلہ ہے مگر کوئی نہ الزم دھرے

ایسے الزام کہ خود اپنے تراشے ہوئے بُت
 جذبہ کاوش خالق کو نگونہ ساز کریں
 موقوفہ حلقہ ابرو کو بنا دے خنجر
 لفظ نوحوں میں رستم مدحِ رخ یار کریں
 رقص مینا سے اُٹھے نغمہ رقصِ بمل
 ساز خود اپنے مغنتی کو گنگار کریں

مریم اشک نہیں زحیم طلب کا چارہ
 خوں بھی روؤ گے تو کس خاک کی سج دھج ہوگی
 کاپیتے ہاتھوں سے ٹوٹی ہوئی بنیادوں پر
 جو بھی دیوار اٹھاؤ گے وہی کج ہوگی
 کوئی پتھر ہو کہ نغمہ کوئی پیکر ہو کہ رنگ
 جو بھی تصویر بناؤ گے اپاہج ہوگی

یہ کیسی رُت ہے

یہ کیسی رُت ہے

کہ ہر شجر

صحنِ گلستاں میں

ملول و تنہا سلگ رہا ہے

طیور چپ چاپ کب سے منقارِ زیرِ پر ہیں

ہوائیں نوحہ کناں

کہ اس باغ کی بہاریں

گئیں، تو پھر لوٹ کر نہ آئیں

یہ کیسی رُت ہے
 نہ برف باری کے دن
 کہ شاخوں کے پیرہن پر
 پسیدۂ صبح کا گماں ہو
 نہ فصلِ گل ہے
 کہ ہر طرف شور جانفروشاں سے
 کوئے محبوب کا سماں ہو
 نہ دورِ پت جھڑکا ہے
 کہ بے جان کونسلوں کو
 اُمیدِ فردائے مہرباں ہو

یہ کیسی رُت ہے
 کوئی تو بولے
 کوئی تو دھڑکے
 کوئی تو بھڑکے



آنکھ سے دُور نہ ہو دل سے اُتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا

اتنا مانوس نہ ہو خلوتِ غم سے اپنی
تو کبھی خود کو بھی دیکھئے گا تو ڈر جائے گا

دوبتے ڈوبتے کشتی کو اچھا لائے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اُتر جائے گا

زندگی تیری عطا ہے تو یہ جانے والا
تیری بخشش تری دہلیز پہ دھر جائے گا

خیر لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مرجائے گا



اب شوق سے کہ جاں سے گزر جانا چاہیے
بول اسے بولائے شہر اکہ دھر جانا چاہیے

کب تک اُسی کو آخری منزل کہیں گے ہم
کوئے مراد سے بھی اُدھر جانا چاہیے

وہ وقت آگیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
گہرے سمندر میں اُتر جانا چاہیے

اب رفتگاں کی بات نہیں کارواں کی ہے
جس سمت بھی ہو گردِ سفر جانا چاہیے

کچھ تو ثبوتِ خونِ تمست کہیں سے
ہے دل تھی تو آنکھ کو بھر جانا چاہیے

یا اپنی خواہشوں کو مقدس نہ جانتے
یا خواہشوں کے ساتھ ہی مرجانا چاہیے

گنتی رات

پھر آگئی ہے، گنتی رات تمہیں خبر بھی نہیں
 خبر مجھے بھی نہیں تھی کہ رات پچھلے پہر
 کسی نے مجھ سے کہا جاگ اے دریدہ حشر
 نشہ ہے سرِ دھیز کوئی بامِ نشیں

بدل چکا تھا سبھی کچھ تمہارے جاتے ہی
فلک کا چاند، زمیں کے گلاب راکھ ہوئے
وہ راکھ خواب ہوئی پھر وہ خواب راکھ ہوئے
تم آسکو تو میں سمجھوں تمہارے آتے ہی

ہر ایک نقش وہی آج بھی ہے جو کل بھتا
یہ راکھ خواب بنے خواب سے گلاب بنے
ہر اک ستارۂ مشرکاں سے مہتاب بنے
بس سداق کا جیسے وصال کا پل بھتا

کردار

ہم ابھی ایسا وہ تھے
 اب سے کچھ پہلے
 وفا کے فرش پائیدہ پہ
 خوش وقتی کے رنگیں شامیانوں کے تلے
 اپنے ہاتھوں میں قرار و قول کی شمعیں بیے
 آئندہ جیوں میں زرنوں میں
 مآبیا مرت سہتہ دینے کے لیے
 آمادہ تھے
 اک دوسرے کے اس قدر دلدادہ تھے

دیکھنے والوں میں شامل
 یار بھی اغیار بھی
 چند آنکھوں میں نمی
 چند آنکھوں میں حقارت، برہمی
 چند آنکھوں میں سکوتِ دائمی
 جم گئے سائے ادھر
 اور کانپ اٹھی اس طرف دیوار بھی
 دشمنوں کو بھی یقین
 اور بدگماں کچھ ہمیشہیں — غمخوار بھی
 دیکھنے والوں نے دیکھا

کس طرح صدیاں اچانک
 ثانیوں میں بٹ گئیں
 شامیانوں کی طنائیں کٹ گئیں

بیمہ نہیں شمعیں قرار و قول کی
 فزنی فدا کی موت و پارسہ سلیں بھی پھٹ گئیں
 و در دوسرے

خود اپنے خنجروں کے در سے
 ناک و نگوں ہیں تر ہتر
 فزنی یہ فدا دوسرے
 ہم ابھی استاد ہوتے



نظر بجھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے
کہ اب تک نہیں آئے ہیں لوگ جب کے گئے

سنے گا کون تری بے وسایوں کا رُغل
یہی ہے رحیم زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

مگر کسی نے ہمیں ہم سفر نہیں جانا
یہ اور بات کہ ہم ساتھ ساتھ سب کے گئے

اب آس تو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لیے
یہ شہر کب سے ہے وہیں وہ لوگ کب کے گئے

گرفتہ دل تھے، مگر حوصلہ نہ ہارا تھا
گرفتہ دل ہیں، مگر حوصلے بھی اب کے گئے

تم اپنی شمع تمنا کو رو رہے ہو سہرا
ان آنکھوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

روزِ ناجہرِ منِ نژاد

روزِ ناجہرِ منِ نژاد

اس کے ہونٹوں میں حرارت

جہم میں طوفاں

برہنہ پنڈلیوں میں آگ

نیرت ہیں فساد

رنگ و نسل و قامت و قد

سرزمینِ ویران کے سب تفرقوں سے بے نیاز

ہر کسی سے بے تکلف ایک حد تک دِلنواز
وہ بھی کی ہم پیالہ ہم نفس
عمر شاید بیس سے اُوپر برس یا دو برس

روزِ ناجرمن نژاد
اور دیکھنے والوں میں سب
اس کی آسودہ نگاہی بے محابا میگزینی کے سبب
پیکرِ تسلیم و سرتاپا طلب
ان میں ہر اک کی متاعِ گل
بہائے التفاتِ نیم شب

روزِ ناجرمن نژاد
اور اس کا دل زخموں سے چُور
اپنے ہمدردوں سے ہمسایوں سے دُور

گھر کی دیواریں نہ دیواروں کے سایوں کا سرور
 جنگ کے آتشکدے کا رزق کب سے بن چکا
 ہر آہنی بازو کا خوں
 ہر چاند سے چہرے کا نور

نملوئیں خاموش و ویراں
 اور ہر دہلیز پر اک مشطرب مرمر کا بُت
 ایستادہ ہے بچشمِ ناصبور
 کون ہے اپنوں میں باقی
 تو سن راہِ طلب کا شہسوار
 ہر درتپکے کا مقدر انتظار

اجنبی مہماں کی دستکِ خواب
 شاید خواب کی تعبیر بھی

چند لمحوں کی رفاقت جاوداں بھی
حسرتِ تعمیر بھی

الوداعی شام، آنسو، عہد و پیمان
مضطرب نہ ناد بھی نچیر بھی
کون کر سکتا ہے در نہ ہجر کے کالے سمندر کو عبور
اجنبی مہاں کا اک حرفِ وفا

نومید چاہت کا غرور
روزِ ناب، اجنبی کے ملک میں خود اجنبی
پھر بھی پترے پر اُدا سی ہے نہ آنکھوں میں تھکن
اجنبی کا ملک جس میں چار سُو
تاریکیاں ہی خیمہ زن
سب کے سایوں سے بدن
روزِ نامر مر کا بُت

اور اس کے گرد

ناپختہ سائے بہت

سب کے ہونٹوں پر وہی حرفِ وفا

ایک سی سب کی صدا

وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس

عمر شائد میں سے اُوپر برس یا دو برس

اس آنکھوں میں تجسّس اور بس



بدن میں آگ ہے چہرہ گلاب جیسا ہے
کہ زیرِ علم کا نشہ بھی شراب جیسا ہے

وہ سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی
یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

کہاں وہ قُرب کہ اب تو یہ حال ہے جیسے
ترے فراق کا عالم بھی خواب جیسا ہے

مگر کبھی کون دیکھے کوئی پڑھے تو سہی
دل آئینہ ہے تو چہرہ گلاب جیسا ہے

ہمارے غوں سے چمن زار بن گئے مقتل
جو نخل دار ہے شاخ گلاب جیسا ہے

فراز سنگِ ملامت سے زخم زخم سہی
ہمیں عزیز ہے خانہ فراب جیسا ہے

فضا نور و بادل

میں سایہ نخل میں کھڑا تھا
جب ایک فضا نور و بادل
لہراتا ہوا نطنہ پڑا تھا

یوں قلب و جگر سے آگ اُٹھی
برسوں کی طویل تشنہ کا مٹی
یکسوخت ہی جیسے جاگ اُٹھی

پل بھر میں بدن دھک رہا تھا
میں سایہ نخل سے نکل کر
بادل کی طرف پکڑا تھا

بادل بھتا سمندر روں کا پیاسا
یہ اس کا کرم کہ چند لمحے
وہ مجھ کو بھی دے گیا دلاسا

دل پر لیے داغِ نامرادی
چاہا کہ پلٹ چلوں ادھر ہی
جس سمت سے درد نے صدادی

دیکھا تو رت بھی جا چکی تھی
مایوس کن انتظار کی دھوپ
اس نخل و فن کو کھا چکی تھی



کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوا نے جا
فراز اور اُسے حالِ دل سنانے جا

کل اک فقیر نے کس سادگی سے مجھ سے کہا
تری جبین کو بھی ترسیں گے آستانے جا

اُسے بھی ہم نے گنوا یا تری خوشی کے لیے
تجھے بھی دیکھ لیا ہے اسے زمانے جا

بہت ہے دولتِ پندار پھر بھی دیوانے
جو تجھ سے رُوٹھ چکا ہے اُسے منانے جا

سُنا ہے اُس نے سو مہر کی رسمِ نازہ کی
فراز تو بھی مستدر کو آزمانے جا



نہ اب جواز نہ موقع ہے ہاتھ ملنے کا
سمی کو شوق رہا راستے بدلنے کا

پہنچ گئے سرِ منہ زل بخوبی قسمت
مگر وہ لطف کہاں ساتھ ساتھ چلنے کا

میں آپ اپنے ہی پندار کے حصار میں ہوں
بجز شکست کہاں راستہ نکھلنے کا

وہ ساعتیں تو ہواؤں کے ساتھ جا بھی چکیں
نظر میں اب بھی بے منظر چراغ جلنے کا

وہ سرد مہر کسی پر نگاہِ لطف کے بعد
فرزِ دیکھ سہاں برف کے پگھلنے کا

فصلِ رائیگاں

زندگی کے خواب فصلِ رائیگاں
 تو دریدہ دل میں آشفستہ بیاں
 زندگی کے خواب فصلِ رائیگاں

رائیگاں ہر درد کے سورج کی ٹھوپ
 آبلے ہاتھوں کے ہاتھوں کا عرق
 گیسوؤں کے ابر ہونٹوں کی شفقت
 میرے دل کی آگ تیرا رنگِ وپ

رایگاہوں خونِ وقت کی ندیاں
کشتِ بے حاصل کا مہل بے نشان

آنسوؤں کی جھیل دو پہروں کی بُ
جسمِ شل احساسِ مردہ دل نہ

چہرہ بانبِ ریت کے ٹیلے روں
کوئی نوحہ گر نہ کوئی چشمِ ند
صفتِ بحر تو بھی کہاں میں بھی کہیں
جیسے ویرانے میں لاشیں بے

بے کفن، بے گور، رزقِ کرّس
اور یہ یادیں بھی کچھ محو کی ہیں
جس طرح صحرا میں قدموں کے نشان
جس طرح تعسّی خا مویش

سلامتی کو نسل

پھر چلے ہیں مرے زخموں کا مداوا کرنے
 میرے غمخوار اُسی فتنہ گرد ہر کے پاس
 جس کی دہلیز پٹپٹکی ہیں لہو کی بوندیں
 جب بھی پہنچا ہے کوئی سوختہ جاں کشتہ یاس
 جس کے ایوانِ عدت میں فروشِ قاتل
 بزمِ آراؤ سخن گستر و فرخندہ لباس
 ہر گھڑی نعرہ زناں "امن و مساوات کی خیر"
 زر کی میزان میں رکھے ہوئے انسان کا ماس

کون اس قتل گاہِ ناز کے سمجھے اسرار
 جس نے بدِ دشنہ کو پھولوں میں جھپا رکھا ہے
 امن کی فاختہ مڑتی ہے نشانِ پریسکن
 نسلِ انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
 اس طرفِ نطق کی بارانِ کرم اور ادھر
 کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے

جب بھی آیا ہے کوئی کشتہ بیداد اُسے
 مرجح و عدۂ فردا کے سوا کچھ نہ ملا
 یہاں قاتل کے طرفدار ہیں سارے قاتل
 کاہنِ دیدہ پڑخوں کا صمد کچھ نہ مد
 کاشمیر کو ریادیت نامِ دو منکن کا نگو
 کسی بھل کو بجز حرفِ دعا کچھ نہ ملا

قصر انصاف کی زنجیر ہلانے والو
 کجکلا ہوں پہ قیامت کا نشہ ہے طاری
 اپنی شمشیر پہ کشکول کو ترجیح نہ دو
 دم ہو بازو میں تو ہر ضرب جنوں ہے کاری
 اس جزیرہ میں کہیں نور کا میسنا نہیں
 جس کے اطراف میں اک قلم خوں ہے جاری
 ”جو ہر جامِ جم از کانِ جہانِ دگر است
 تو توقع ز گلِ کوزہ گراں می داری“



گزارا ہوں جس طرف سے بھی پتھر لگے مجھے
ایسے بھی کیا تھے لعل و جواہر لگے مجھے

لو ہو چکی شفا کہ مداوائے درد دل
اب تیری دسترس سے بھی باہر لگے مجھے

ترسا دیا ہے ابرگریزاں نے اس قدر
برسے جو بوند بھی تو سمندر لگے مجھے

تھامے رہو گے جسم کی دیوار تابکے
یہ زلزلہ تو روح کے اندر لگے مجھے

گر روشنی یہی ہے تو اسے بد نصیب شہر
اب تیرگی ہی تیرا امتداد لگے مجھے

منزل کہاں کی زاد سفر کو بچا بیو!
اب رہزنوں کی نیت رہبر لگے مجھے

وہ مطمئن کہ سب کی زباں کاٹ دی گئی
ایسی خموشیوں سے گرڈ لگے مجھے

وہ قحطِ حرفِ حق ہے کہ اس عہد میں فراز
خود سا گنہگار سمیٹ لگے مجھے



مرے قلم پہ رہی نوک جس کے خنجر کی
سنا ہے اس کی زباں بھی ہوئی ہے پتھر کی

رواں ہے قلمِ غول اندرونِ شہر بھی دیکھ
کہ خوشنما تو بہت ہے فصیل باہر کی

اُجاڑ پیر گئے موسموں کو روتے ہیں
ہر آنسو کو ہو س پی گئی سمندر کی

فیقہہ شہر جہیں پر کلاہِ زر رکھے
نسا رہا ہے ہمیں آیتیں مفتدر کی

خود اپنے خوں میں نہاے ہوئے گر چپ ہیں
یہ لوگ ہیں کہ چٹانیں ہیں سسج پتھر کی

وہ ایک شخص کہ سورج کے رُپ میں آیا
چرا کے لے گیا شمعیں سنہرا زہر گھر کی

خاک اور نخوں میں لت پت لاش

کے ہونٹوں پر

اک بات جمی ہے

یہ قاتل ہے

لیکن کس کا

یہ اپنی تخلیق کا قاتل

اس نے خود کو قتل کیا ہے

لوگوں کا ابنوہ مگر

کب مُنتا ہے

کون ہے قاتل

کس نے

کس کو قتل کیا ہے؟

نہیں ہے یوں

نہیں ہے یوں کہ مراد کھ مری حدود میں ہے
 نہ صرف دل ہی دریدہ نہ صرف جاں ہی فگار
 نہ صرف دیکھیتی آنکھوں میں حسرتوں کا دھواں
 نہ صرف ہاتھ شکستہ نہ سر پہ زخیم ہزار

جو یوں بھی ہو تو بڑی بات ہے تری قربت
 تری دُست تری چاہت تری سیمائی
 ہر ایک زخم کو دھو دے شفیق ہاتھوں سے
 ہر ایک درد کو چن لے تری دل آرائی

نکریہ درد یہ دکھ کب مری حدود میں ہے
 کہاں نہیں مرا پس کر کہاں نہیں فیعتاں
 تو اک وجود کو زندہ تو کر چکے لسیکن
 ہر اک صلیب پر میرا ہی جسم آویزاں
 ہر ایک تیر ستم پر مرا لہو لرزاں
 کسے کسے تو بچائے گی اے مری درماں



مزاج ہم سے زیادہ جدا نہ تھا اُس کا
جب اپنے طور ہی تھے تو کیا گد اُس کا

وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اُسے گماں بھی نہیں میں نہیں رہا اُس کا

وہ برق رُو تھا مگر رہ گیا کہاں جانے
اب انتظار کریں گے شکستہ پا اُس کا

چلو یہ سیلِ بلا خیز ہی بنے اپنا
سفینہ اُس کا، خدا اُس کا، نا خدا اُس کا

یہ اہل درد بھی کس کی دُہائی دیتے ہیں
وہ چپ بھی ہو تو زمانہ ہے ہمنا اُس کا

ہم بھی نے ترکِ تعلق میں پہل کی کہ فساد
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اُس کا



چلو اُسی سے کہیں دل کا حال جو بھی ہو
وہ چارہ گر تو ہے اس کو خیال جو بھی ہو

اُسی کے درد سے ملتے ہیں سلسلے جاں کے
اُسی کے نام لگا دو ملال جو بھی ہو

مرے نہ ہمارے ہم قیس و کوہن کی طرح
اب عاشقی میں ہماری مثال جو بھی ہو

یہ رہنما رہ جو شمعیں دیکھتی جاتی ہیں
اُسی کا قامتِ زیبا ہے چال جو بھی ہو

فراز اس نے وفا کی کہ بے وفائی کی
جوابدہ تو ہمہی ہیں سوال جو بھی ہو

کُشان بی بیؑ

تو جب

بہریت کے قاتل پہاڑوں کی صلیبوں سے اتر آئے

تو یہ جانا

کہ ہم دشتِ عدم کو پار کر آئے
ہراک کے پاؤں چھلنی جسمِ شل
اعضاءِ تھکن سے چور

لیکن سب

ہر اس مرگ سے بے جان - بے حس تھے

✽ کافرستان کی ایک لڑکی

بسبھی یوں زرد رُو جیسے
 ابھی تک آسمانوں کے سفر سے لوٹ کر
 رُو حیں نہیں آئیں
 چوہ سب کے سب زندہ ہیں
 جیسے بھی ہیں کیجا ہیں
 فحیاء، ہاستہ، سیدہ اور یہ

نور میزبان کب سے نہ جانے
 گھٹ کے دروازے کھٹے چھوڑے
 سبک شہتیر کے پل پر ہمارا منتظر تھا
 اس کو یہ معلوم تھا
 ہم اجنبی مہماں
 سیاحت کے لیے کن مشکلوں سے
 ہفت خواں طے کر کے
 اس وادی میں آئیں گے

چناروں کے بلند اشجار

انگوروں کی بلیں

چار سوسبزہ

ہوائیں بید مشک و عود و مِر کی خوشبوؤں سے

چور بھیل

طائرانِ خوشنما و خوش نوا — بے کل

سب رفتار چشموں کی تہوں میں

پتھروں کا نسیم و یا قوت سا چھل بل

ادھر کچھ دور بڑغالوں کے گلے

نوجواں چڑا ہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت

برن سے شفاف و دل آرا

فضا جیرت فزا — سحر آفریں دنیا

”مژہ برہم مزن تان شکنی رنگ تماشا را“

ہمارا میرزا باں مفلس تھا
 لیکن شام کو خوانِ فیاض دیکھ کر
 ہم خاص بندہاں تھے
 کشادہ طشت میں بزغالہ بریاں
 بطک میں آبِ تاک
 اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
 الاؤ میں دہکتی آگ
 کتنی گرم کتنی خوبصورت تھی

مگر ہم منتظر اس پل کے تھے
 جب کافرستاں کی جواں پریاں
 زمینی حسد کی حواریں
 دت و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
 اپنے محبوبوں کی فرقت کے

نیشے گیت گائیں گی
 الف لیلہ کے شہزادوں کی صورت
 ہم میں ہر اک
 اس طلسماتی فضا کے سحر میں گم تھا
 بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
 یہ بلبوس میں لیٹے ہوئے
 مر مر کے بُت
 مہتاب سے پکر

بس بھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
 کماں کی شکل میں جُنباباں
 کہ جیسے دیوتاؤں کے رقصوں کی گھوڑیاں
 وحشت سے پاگوں باں
 دف و دمامہ و مردنگ کے آہنگ میں
 آہستہ آہستہ

کھٹکتے قہقہے — محبوب آوازیں بھی

شامل ہو گئیں آخر
 کہ جیسے فقری گھنگرو
 اچانک جھجھنا اٹھیں
 بھی غارت گر تمکین و ہوش و دشمن ایماں
 ہر اک فتنہ گر و دراں
 مگر وہ سرگروہ نازتیناں
 غیرت نابہد
 نان سلسلہ حواں
 کشان لی بی
 قد و قامت قیامت
 بختیش جادو
 بدن طوقاں

ضیا کر دار میں گوتم
 بحتم صدق و ایثار و وفا

درد آتشنا و نفس کش ہمدم
 لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا
 مگر سب ساتھیوں سے کم

بتان آذری رقصاں
 مگر باسط جواک فنکار
 لیکن شکوہ سنج زندگی ہر دم
 قلم اس کا ڈرافٹاں و گہر تحریر
 لیکن خود تھی داماں
 شکستہ دل

خود اپنے فن سے اپنے آپ سے تالاں
 یہاں دنیا کے غم بھولا ہوا
 بسمل

ہر اک پکیر پہ سو سو جان سے قرباں

سعد اک کم نظر جذبات کا پتلا
ہندس

اور فقط جسموں کا سوداگر
جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا
کئی تحفے

ملنے کی ہوتیں انگوٹھیاں
جھوٹے نگوں کے ہار

دل آویز آویزے
کسی ماہر شکاری کی طرح
اپنی کھمبہ و دم پر نازاں
ہر اک پر سحر طاری تھا
بازن آذری کا قص جاری تھا

نیا حیرت میں گم

باسط ز خود رفتہ

سعد افسوں زدہ

میں بُت

کشان بی بی کے لب

کلیوں کی صورت نیم وا

اور ہم فقط

آواز کی خوشبو سے پاگل

لذتِ معنی سے نامحرم

زبانِ یار کی لاشی و ما از حرفِ بیگانہ

(ہمارے میزبان نے ترجمانی کی)

کشان بی بی یہ کہتی ہے

”مرے محبوب تو اک دستہ مڑ ہے

کہ جو زاتوں کو میری چھاتیوں کے درمیاں

خوشبو لٹاتا ہے

مری بھولیو!

بستی کے سارے نوجوانوں میں

مرا محبوب پیارا

جس طرح بن کے درختوں میں ہونکل سیب استادہ

مرا محبوب

جیسے جھاڑیوں کے درمیاں کوئی گلی سوسن

مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا

اُس نے مجھ سے خوب باتیں کیں

وہ کہتا تھا کہ اے میری پری

اے نازنین

اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل

برسات کا موسم چلا

بادل برس کر کھل چکے

انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اٹھی

اے کوہاروں کی چکوری

تو نہ جانے کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے

آمرے ہمراہ چل پاری

بتان آذری کا رقص جاری تھا

فضا پر سحر طاری تھا

ہراک کی آنکھ میں تار کی طرح

وہ کافرستان کی قلو پٹہ

مگر ہم میں کوئی سیزر نہ استونی

ضیا گو تم سہی

لیکن کشن بی بی

وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سوچی جائے ہے مجھ سے

نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی

لیکن سحر دم

جب پرندوں کے چمکنے کی صدا آئی

کشان بی بی

یہ ملبوس میں لپٹی

جہیں پر کوڑیوں کا تاج
 گالوں پر گھنی زلفیں
 کینیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے
 رخصت ہوئی ہم سے
 بصد انداز استغنا و دارائی
 تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر
 اور پتھر تھے تماشائی



ترپ اٹھوں بھی تو طالم تری دہائی نہ دوں
میں زخم زخم ہوں پھر بھی تجھے دکھائی نہ دوں

ترے بدن میں دھڑکنے لگا ہوں دل کی طرح
یہ اور بات کہ اب بھی تجھے سنائی نہ دوں

خود اپنے آپ کو پرکھا تو یہ ندامت ہے
کہ اب کبھی اسے الزام بے وفائی نہ دوں

مری بھت ہی مری خواہش گناہ میں ہے
میں زندگی کو کبھی زہر پارسائی نہ دوں

جو ٹھن گئی ہے تو یاری پہ صرف کیوں آئے
حریتِ جاں کو کبھی طعنِ آشنائی نہ دوں

مجھے بھی ڈھونڈ کبھی محو آئینہ داری
میں تیرا عکس ہوں لیکن تجھے دکھائی نہ دوں

یہ حوصلہ بھی بڑی بات ہے شکست کے بعد
کہ دوسروں کو تو الزامِ نارسانی نہ دوں

فرازِ دولتِ دل ہے متاعِ محسوس
میں جامِ جم کے عوض کا سہ گدائی نہ دوں

خواب جھوٹے خواب

خواب جھوٹے خواب میرے خواب تیرے خواب بھی
 درد کی لذت بھی دھوکا قرب کا غم بھی فریب
 بے قراری بھی نمائش خام یا رائے شکیب
 تشنگی کی آگ بھی متاثر شرابِ ناب بھی

میں نے جس دریا کی وسعت دیکھ کر چاہا اُسے
وہ تو میری موجِ غم سے بھی تنہا پایا سب تر
تو بڑھی جن ساحلوں کی سمت مجھ کو دیکھ کر
تشنگی اُن کی بچھا سکتی نہیں سیلاب بھی

دائیموں میں مبتلا ہم آج تک سمجھا کیے
تیرا آئینہ بھی سورج میرے پتھر بھی گلاب
آداب تسلیم کر لیں سب غلط باتیں کہیں
کاغذی ہیں پھول میرے تیرے دریا بھی سراب
خواب جھوٹے خواب میرے خواب تیرے خواب بھی

ایسہ

تجھ سے کچھڑا ہوں تو آج آیا مجھے اپنا خیال
ایک قطرہ بھی نہیں باقی کہ ہوں پلکیں تو غم
میری آنکھوں کے سمندر کون صحرا پی گئے
ایک آنسو کو ترستی ہے مری تقریب غم

میں نہ رو پایا تو سوچا مسکرا کر دیکھ لوں
شاید اس بے جان پیکر میں کوئی زندہ ہو خواب
پر لبوں کے تن برہنہ شاخچوں پر اب کہاں
مسکراہٹ کے شگوفے خندہ دل کے گلاب

کتنا دیراں ہو چکا ہے میری ہستی کا جمال
تجھ سے کچھڑا ہوں تو آج آیا مجھے اپنا خیال



درد کی راہیں نہیں آساں ذرا آہستہ چل
اے بسک روئے حریفِ جاں ذرا آہستہ چل

منزلوں پر قرب کا نشہ ہوا ہو جائے گا
ہمسفر وہ ہے تو اے ناداں ذرا آہستہ چل

نامرادی کی تھکن سے جسم پتھر ہو گیا
اب سکت کیسی دلِ ویراں ذرا آہستہ چل

جام سے لب تک ہزاروں لغزشیں ہیں غمِ شش نہ ہو
اب بھی محرومی کا ہے امکان ذرا آہستہ چل

ہر تھکا ہارا مسافر ریت کی دیوار ہے
اسے ہوائے منزلِ جاناں ذرا آہستہ چل

اس نگر میں زلف کا سایہ نہ دامن کی ہوا
اسے غریب شہرِ ناپرساں ذرا آہستہ چل

آبلہ پا تجھ کو کس حسرت سے تکتے ہیں فراز
کچھ تو ظالم پاس ہماراں ذرا آہستہ چل



گلہ نہ کر دل ویراں کی ناسپاسی کا
تراکرم ہی سبب بن گیا اداسی کا

ملول کر گئی ویران ساعتموں کی صدا
چمن میں جی نہ لگا جنگلوں کے باسی کا

بھرم کھلا ہے کہ جب اس سے ہم کلام ہو
ہمیں بھی زعم تھا پیارے سخن شناسی کا

شکستِ عہد کوئی ایسا سانحہ تو نہ بھتا
تجھے بھی رنج ہوا بات اک ذرا سی کا

فراز آج شکستہ پڑا ہوں بُت کی طرح
میں دیوتا تھا کبھی ایک دیو داسی کا

نذرِ نذرل*

فنکار جو اپنے سحرِ فن سے
پتھر کو زبانِ نبشتا ہے
الفاظ کو ڈھال کر صدائیں
آواز کو جانِ نبشتا ہے
تاریخ کو اپنا خون دے کر
تہذیب کو شانِ نبشتا ہے

* نذرِ الاسلام

فنکار خموش ہو تو حباب
 عظمت کے نشان کھولتا ہے
 ہر اہل نظر کو دستِ قاتل
 نیزے کی آنی پہ تولتا ہے
 انسان بزورِ خاک و خون میں
 انساں کے حقوق رولتا ہے

فنکار اگر زباں نہ کھولے
 انبارِ گہر نصیب اُس کا
 ورنہ ہر شہر یار دشمن
 ہر شیخِ عرم رقیب اُس کا
 چاہے وہ فسار ہو کہ نذرل
 بولے تو صلہ صلیب اُس کا



صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے
بادل سمندروں پہ برستا دکھائی دے

اس شہرِ غم کو دیکھ کے دل ٹوٹنے لگا
اپنے پہ ہی سہی کوئی ہنستا دکھائی دے

اے صدرِ بزمِ مے تری ساتی گری کی خیر
ہر دل بسانِ شیشہ شکستہ دکھائی دے

گرے نہیں تو زہر ہی لاؤ کہ اس طرح
شاید کوئی نجات کا رستہ دکھائی دے

اے چشم یار تو بھی تو کچھ دل کا حال کھول
ہم کو تو یہ دیار نہ بستا دکھائی دے

جنسِ منہر کا کون خریدار ہے سدا
ہیرا، کہ پتھروں سے بھی سدا دکھائی دے



یہ دل کا چور کہ اس کی ضرورتیں تھیں بہت
وگر نہ ترکِ تعلق کی صورتیں تھیں بہت
ملے تو ٹوٹ کے روئے نہ کھل کے باتیں
کہ جیسے اب کے دلوں میں کدورتیں تھیں بہت

بھلا دیے ہیں ترے غم نے دکھ زمانے کے
خدا نہیں تھا تو پتھر کی موتیں تھیں بہت

دریدہ پیر مہنوں کا خیال کیا آتا؟
امیر شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

فرازِ دل کو نگاہوں سے اختلاف رہا
وگر نہ شہر میں ہم شکل صورتیں تھیں بہت

چلو اُس بُت کو بھی رو لیں

چلو اُس بُت کو بھی رو لیں
جسے سب نے کہا پتھر
مگر ہم نے خدا سمجھا
خدا سمجھا

کہ ہم نے پتھروں میں عمر کاٹی تھی
کہ ہم نے معبدوں کی خاک چاٹی تھی

کہ پتھر تو کہیں دیوارِ زنداں
 اور کہیں دبیزِ مقلّ تھے
 کبھی سرمایہ داماںِ خلقت
 اور کبھی بختِ جنوں کیشاں
 کبھی ان کا ہدف دکانِ شیشہ گر
 کبھی صورتِ گرہنگامہ طفلان
 کبھی بے نور آنکھوں کے نشاں
 بے اشک بے رماں
 کبھی لوحِ مزارِ جاں
 نہ چارہ گر نہ اہلِ درد کے درماں
 مگر وہ بُت

چراغِ بزمِ تنہائی
 مجسمِ رنگ و رعنائی
 فضا کی روشنی
 آنکھوں کی بینائی

سکونِ جاں
 وہ آنکھیں ورد کی جھیلیں
 وہ لبِ چاہت کے شعلوں سے بھرے مرجاں
 وہ بُتِ انساں
 مگر ہم نے وفورِ شوق میں
 فرطِ عقیدت سے کہا یزداں
 یہ ہم کافر
 کہ دنیا کم نظر ناداں

بسکھی لائے ہمارے سامنے اور اقی پارِ نہ
 کہ جن پر نقش تھے
 اہلِ وفا کے عکسِ دیرینہ
 شکستہ استخوانِ بے جانِ نابینا
 جبیں سجدوں سے داغی
 اور زخموں سے بھرا سینہ

اور ان کے بُت
 نال سوزِ اہلِ دل سے بے پروا
 بھی خود بین و خود آرا
 ہر اک محلِ نشیں تنہا
 مگر مصروفِ نظارِ

اور اب ہم بھی گرفتہ دل
 نہ محرومی کو سہہ پاتیں
 نہ بربادی چھپانے کے رہے قابل
 وہ بُتِ مرمر کی ریل
 اور اہلِ سجدہ کی جہیں گھائل
 سبھی کی بات سچ
 اور ہمِ ندامت کے عرق میں ترتر
 شرمندگی کے کرب سے سہل

چلو اب اپنے جیسے نامرادوں سے نہیں بولیں
 جو وہ کہتے ہیں وہ بولیں
 جس کے داغ، نکھوں کا لہو دھولیں
 چلو اس جُبت کو بھی رولیں



سائے کی طرح نہ خود سے رم کر
دیوار کو اپنا ہم قدم کر

اپنے ہی لیے بسا نہ دریا
اوروں کے لیے بھی آنکھ نم کر

تیکمیل طلب نہیں بے سنسن
طے راہ و فنا قدم قدم کر

اسے پھپھی رُتوں کو رونے والے
آنے والے دنوں کا غم کر

ممکن ہو تو تیشہ ہنر سے
ہر پارہ سنگ کو صنم کر

ہے چشم براہ ایک دنیا
پتھر کی طرح نہ بیٹھ جسم کر

یہ راہ جنوں ہے اس میں پیارے
ممکن ہو تو احتیاط کم کر

اے قصر جہاں یہ تیرا مہار
تو ہاتھ فراز کے مستم کر



دولتِ درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا
آنکھ میں بوند نہ ہو دل میں ہمت نہ رکھنا

کل گئے گزرے زمانوں کا خیال آئے گا
آج اتنا بھی نہ راتوں کو منور رکھنا

اپنی آشفۃ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کالج کا پیکر رکھنا

اُس کب دل کو نہیں تھتی ترے آجانے کی
پر نہ ایسی کہ قدم گھر سے نہ باہر رکھنا

ذکر اس کا سہی بزم میں بیٹھے ہونہ راز
درد کیسا ہی اُسٹھے ہاتھ نہ دل پر رکھنا

خونبہا

اُجرتی و تاتل کی صورت

بے حس و بے درد لمحوں کا خدا

آج پہلی بار جیسے قتل کر کے

سخت شرمندہ ہوا

بے گناہی کے لہو میں تر بہتر
 معصومیت کی راکھ میں لت پت
 تڑپتی آرزو چینی
 کہ آخر کس عداوت کس ارادے
 کس خطا کی یہ سزا

ایک منعم کی طرح
 اُجرتی قاتل نے میرے سامنے
 بکھرے ہوئے اوراق پر
 لفظوں کے کچھ لعل و گہر
 یا قوت و مرجاں — رکھ دیے

لوگوں بہا
 ، درمیں مقتبوں کے مجبور وارث کی طرح
 چپ ہو گیا

نوحہ

اگرچہ مرگِ وفا بھی اک
 سانحہ ہے لیکن یہ بے بسی
 س سے بڑھ کے جانکا ہے
 کہ جب تم خود اپنے ہاتھوں
 سے اپنی چاہت کو نامرادی
 کے رنگِ ناروں میں دھن
 کر کے جدا ہوئے تو نہ
 تیری پلکوں پہ کوئی آنسو
 لرز رہا تھا نہ میرے ہونٹوں
 پہ کوئی جاں سوز مرثیہ تھا



یاد آتا ہے تو کیوں اُس سے گلہ ہوتا ہے
وہ جو اک شخص ہمیں بھول چکا ہوتا ہے

ہم ترے عطف سے نادم ہیں کہ اکثر اوقات
دل کسی اور کی باتوں سے دکھا ہوتا ہے

مل گئے ہو تو چلو رسم زمانہ ہی سہی
ورنہ اب پرسش احوال سے کیا ہوتا ہے

اس قدر زہر نہ بھتا طہیز حریفان پہلے
اب تو کچھ خندہ یاراں سے سوا ہوتا ہے

سادہ دل چارہ گروں کو نہیں معلوم سراز
بعض اوقات دلا سا بھی بلا ہوتا ہے

چاند اور میں

چاند سے میں نے کہا اے مری راتوں کے رفیق
تو کہ گزشتہ دن تھا سدا میری طرح

اپنے سینے میں چھپانے ہوئے لاکھوں گھاؤ
تو دکھاوے کے لیے ہنستا رہا میری طرح

ضوفاں حسن ترا میرے ہنر کی صورت
اور مقتدر ہیں اندھیرے کی ردا میری طرح

وہی تقدیر تیری میری زمیں کی گردش
وہی افلاک کا پنجیر و فسا میری طرح

وہی صحرائے شبِ زیت میں تنہا سفری
وہی ویرانہ جاں دشتِ بلا میری طرح

آج کیوں میری رفاقت بھی گراں ہے تجھ کو
تو کبھی اتنا بھی افسردہ نہ تھا میری طرح

چاند نے مجھ سے کہا: اے میرے پاگل شاعر
تو کہ محرم ہے سرے قریۂ تنہائی کا

تجھ کو معلوم ہے جو زخمِ مری روح میں ہے
مجھ کو حاصل ہے شرفِ شناسائی کا

موجزن ہے میرے اطراف میں اک بحرِ سکوت
اور چرچا ہے فضا میں تیسری گویائی کا

آج کی شب میرے سینے پہ دہ قایل ۱۶۱
جس کی گردن پہ دمکتا ہے لہوِ بھائی کا

میرے دامن میں نہ میرے ہیں نہ سونا چاندی
اور نہ بجز اس کے نہیں شوقِ تمستائی کا

مجھ کو دکھ ہے کہ نہ لے جائیں یہ دُنیا والے
میری دُنیا ہے خزانہ میری تنہائی کا



دافستگى مى دل كا چلن انتہا كا تھا
اب بُت پرستى جو نہ قائل حندا كا تھا

مجھ كو خود اپنے آپ سے شرمندگى ہوئی
وہ اس طرح كه تجھ پہ بھروسہ بلا كا تھا

وار اس قدر شديد كه دشمن ہى كر سكتے
چہرہ مگر غصہ و ركسى آشنا كا تھا

اب يہ كه اپنى كشت تمنا كو روپيے
اب اس سے كيا گلہ كه وہ بادل ہوا كا تھا

تُو نے بچھڑكے اپنے سرازام لے ليا
ورنہ سراز كا تو يہ رونا سدا كا تھا

کھرا

یوں بھی ہوتا ہے برسوں کے دو تہ سفر
 اپنے خوابوں کی تعبیر سے بے خبر
 اپنے عہدِ محبت کے نشے میں گم
 اپنی قسمت کی خوبی پہ نازاں مگر
 زندگی کے کسی موڑ پر کھو گئے
 اور اک دوسرے سے جدا ہو گئے

یوں بھی ہوتا ہے دو اجنبی راہ رو
 اپنی راہوں سے منزل سے نا آشنا
 ایک کو دوسرے کی خیر تک نہیں
 کوئی پیمان الفت نہ عہد وفا
 اتفاقات سے اس طرح مل گئے
 ساز بھی بچ اُسٹے پھول بھی کھل گئے



لگا کے زخم بدن پر قبائیں دیتا ہے
یہ شہر یار بھی کیا کیا سزائیں دیتا ہے

تمام شہر ہے مقتل اسی کے ہاتھوں سے
تمام شہر اسی کو دعائیں دیتا ہے

کبھی تو ہم کو بھی بننے وہ ابر کا ٹکڑا
جو آسمان کو نیلی ردائیں دیتا ہے

جدائیوں کے زمانے پھر آگئے شاید
کہ دل ابھی سے کسی کو صدائیں دیتا ہے



چلے تھے یار بڑے زعم میں ہوا کی طرح
پلٹ کے دیکھا تو بیٹھے ہیں نقشِ پا کی طرح

مجھے وفا کی طلب ہے مگر ہر اک سے نہیں
کوئی ملے مگر اس یارِ بے وفا کی طرح

مرے وجود کا عجز اب سے منتظر کب سے
کبھی تو آجرِ سرِ غنچہ کی صدا کی طرح

ٹھہر گئی ہے محبت کہاں کہ مدت سے
نہ ابتدا کی طرح ہے نہ انتہا کی طرح

وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھیر کر آنکھیں
گزر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح

فراز کس کے ستم کا گلہ کریں کس سے
کہ بے نیاز ہوئی خلق بھی خدا کی طرح

اگر یہ سب کچھ نہیں.....

ملے تو ہم آج بھی ہیں لیکن
نہ میرے دل میں وہ تشنگی تھی
کہ تجھ سے مل کر کبھی نہ بچھڑوں
نہ آج تجھ میں وہ زندگی تھی
کہ جسم و جاں میں اُبال آئے
نہ خواب زاروں میں روشنی تھی

نہ میری آنکھیں چراغ کی لو
 نہ تجھ میں ہی خود سپردگی تھی
 نہ بات کرنے کی کوئی خواہش
 نہ چُپ ہی میں خوبصورتی تھی
 مجسموں کی طرح تھے دونوں
 نہ دوستی تھی نہ دشمنی تھی

مجھے تو کچھ یوں لگا ہے جیسے
 وہ ساعتیں بھی گزر گئی ہیں
 کہ جن کو ہم لازمِ زوال سمجھے
 وہ خواہشیں بھی تو مر گئی ہیں
 جو تیرے میرے لہو کی حدت
 کو آخرش برفِ کرگئی ہیں
 محبتیں شوق کی چٹانوں
 سے گھاٹیوں میں اتر گئی ہیں

وہ قربتیں وہ جدائیاں سب
 غبار بن کر بکھر گئی ہیں
 اگر یہ سب کچھ نہیں تو بتلا
 وہ چاہتیں اب کدھر گئی ہیں



یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فراز تجھ کو نہ آئیں محبتیں کرنی

یہ قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں
شمار ابھی سے جدائی کی رعایتیں کرنی

کوئی خدا ہو کہ پتھر جے بھی ہم چاہیں
تمام عمر اُسی کی عبادتیں کرنی

سب اپنے اپنے قرینے سے منتظر اس کے
کسی کو شکر کسی کو شکایتیں کرنی

ہم اپنے دل سے ہیں مجبور اور لوگوں کو
ذرا سی بات پہ برپا قیامتیں کرنی

میں جب اُن سے تو مبہم سی گھنٹا گونا
پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کرنی

یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نبھاتے ہیں
ہمیں تو راس نہ آئیں محبتیں کرنی

کبھی فراز نئے موسموں میں دینا
کبھی تلاش پُرانی رفاقتیں کرنی



فیقہہ شہر کی مجلس سے کچھ بھلا نہ ہوا
کہ اس سے مل کے مزاج اور کافر نہ ہوا

ابھی ابھی وہ ملا تھا ہزار باتیں کہیں
ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا

وہ رات بھول چکو وہ سخن نہ دھڑاؤ
وہ رات خواب ہوئی وہ سخن فسانہ ہوا

کچھ اب کے ایسے کڑے تھے فراق کے موسم
تری ہی بات نہیں میں بھی کیا سے کیا نہ ہوا

ہجوم ایسا کہ راہیں نطس نہیں آئیں
نصیب ایسا کہ اب تک تو قافلہ نہ ہوا

شہیدِ شب فقط احمد سرازہی تو نہیں
کہ جو چراغ بکف تھا وہی نشانہ ہوا

وہنام

مجھے یقین ہے
 کہ جب بھی تاریخ کی عدالتیں
 وقت لائے گا
 آج کے بے ضمیر و دیدہ دلیر قاتل کو
 جس کے دامان و آستین
 خون بے گناہاں سے تر ہے

تو نسلِ آدم
 و فورِ نفرت سے رُوئے قاتل پہ تھوک دے گی
 مگر مجھے اس کا بھی یقیں سے
 کہ کل کی تاریخ
 نسلِ آدم سے یہ بھی پوچھے گی
 اے مہذب جہاں کی مخلوق
 کل ترے رُو برو یہی بے ضمیر ستار
 ترے قیلے کے بے گناہوں کو
 جب تہہ تیغ کر رہا تھا
 تو تو تماشا بیوں کی صورت
 خموش و بے حس
 درندگی کے مظاہرے میں شریک
 کیوں دیکھتی رہی سے
 تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں

بتا کہ اس ظلم کش قاتل کی تیغ تراں ہیں
 اور تری مصلحت کے تیروں میں
 فرق کیا ہے ؟
 تو سوچتا ہوں
 کہ ہم سبھی کیا جواب دیں گے



فراز کی شاعری غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین سنگم ہے۔ ان کی غزلیں اس تمام کرب و الم کی غمازی کرتی ہیں جس سے ایک حساس اور رومانٹک شاعر کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی نظمیں غمِ دوراں کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں اور ان کی کہی ہوئی بات ”جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے۔“

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر